○ ... ۱۸۲۱ء

چاہے گر جنّت، جز آدم وارثِ آدم نہیں شوخیِ ایمانِ زاہد، سستیِ تدبیر ہے
شب دراز و آتشِ دل تیز، یعنی مثلِ شمع! مہ، ز سر تا ناخنِ پا، رزقِ یک شبگیر ہے
آب ہو جاتے ہیں، ننگِ ہمتِ باطل سے مرد
اشک پیدا کر، اسدؔ، گر آہ بے تاثیر ہے

رُباعیات

دل، سوزِ جنوں سے جلوہ منظر ہے آج نیرنگِ زمانہ، فتنہ پرور ہے آج
یک تارِ نفَس میں، جوں طنابِ صبّاغ ہر پارۂ دل، بہ رنگِ دیگر ہے آج

مشکل ہے، زبس، کلام میرا، اے دل سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی، کرتے ہیں فرمائش م "گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل"

اِضافہ آخرِ نسخۂ حمیدیہ

۱۸۲۲ء
تا
۱۸۲۶ء

مُتفرق

نسخۂ شیرانی

۱۸۲۶ء

○ ...بعد از ۱۸۲۱ء (حاشیہ ق)

جھکی میں مرگیا، جو نہ بابِ نبرد تھا م عشق نبردِ پیشہ، طلب گارِ مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا م اڑنے سے پیشتر بھی، مرا رنگ زرد تھا
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں م مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
دل تا جگر، کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب م اس رہ گزر میں، جلوۂ گل، آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی کشمکشِ اندوہِ عشق کی م دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا
احباب، چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے م زنداں میں بھی، خیالِ بیاباں نورد تھا
یہ لاشِ بے کفن، اسدِ خستہ جاں کی ہے م حق مغفرت کرے! عجب آزاد مرد تھا

محرم نہیں ہے تو ہی، نواہائے راز کا م یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے م یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا
تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز! م میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں م طعمہ ہوں، ایک ہی نفسِ جاں گداز کا
ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے م ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا، کہ ہے ہنوز م ناخن پہ قرض، اس گرہِ نیم باز کا
تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا، اسدؔ م سینہ، کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

دوست، غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا؟ م زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا؟

○ ...بعد از ۱۸۲۱ء (حاشیہ ق)

بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور کب تلک م ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرماویں گے "کیا"؟
حضرتِ ناصح گر آویں، دیدہ و دل فرشِ راہ م کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں م عذر، میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا؟
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا، یوں، سہی م یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا؟
خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟ م ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبراویں گے کیا؟
ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت، اسدؔ م ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھاویں گے کیا؟

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا م درد کا حد سے گزرنا، ہے دوا ہو جانا
تجھ سے، قسمت میں مری، صورتِ قفلِ ابجد م تھا لکھا، بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
دل ہوا، کشمکشِ چارۂ زحمت میں، تمام م مٹ گیا، گھسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ، اللہ م اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
ضعف سے، گریہ، مبدل بہ دمِ سرد ہوا م باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال م ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے، ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا م روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس م کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل م دیکھ برسات میں، سبز آئینے کا ہو جانا
بخشے ہے جلوۂ گل، ذوقِ تماشا، غالبؔ م چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

○ ... بعد از ۱۸۲۱ء (حاشیہ ق)

پھر ہُوا وقت کہ ہو بال کُشا موجِ شراب ۔ م ۔ دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن ۔ م ۔ سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
جو ہوا غرقۂ مے، بختِ رسا رکھتا ہے ۔ م ۔ سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے، اگر ۔ م ۔ موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب
چار موج اُٹھتی ہے، طوفانِ طرب سے ہر سُو ۔ م ۔ موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب
جس قدر رُوحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز ۔ م ۔ دے ہے تسکیں، بدمِ آبِ بقا، موجِ شراب
بس کہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر ۔ م ۔ شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا، موجِ شراب
موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال ۔ م ۔ ہے تصوّر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب
نشّے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ ۔ م ۔ بس کہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہے طوفانیِ کیفیّتِ فصل ۔ م ۔ موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب
شرحِ ہنگامۂ مستی ہے، زہے! موسمِ گل ۔ م ۔ رہبرِ قطرہ بدریا ہے، خوشا! موجِ شراب
ہوش اُڑتے ہیں مرے، جلوۂ گل دیکھ، اسدؔ ۔ م ۔ پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت ۔ م ۔ پھر اک روز مرنا ہے، حضرت سلامت
جگر کو مرے، عشقِ خونابہ مشرب ۔ م ۔ لکھے ہے: "خداوندِ نعمت سلامت!"
دو عالم کی ہستی پہ خطِّ فنا کھینچ ۔ دل و دستِ اربابِ ہمّت سلامت!
علی الرّغمِ دشمن شہیدِ وفا ہوں ۔ م ۔ مبارک! مبارک! سلامت! سلامت!

○ ... بعد از ۱۸۲۱ء (حاشیہ ق)

نہیں گر بہ کامِ دلِ خستہ، گردوں ۔ جگر خائیِ جوشِ حسرت سلامت!
نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی ۔ م ۔ تماشائے نیرنگِ صورت سلامت!
نہ اوروں کی سنتا، نہ کہتا ہوں اپنی ۔ سرِ خستہ و شورِ وحشت سلامت!
وفورِ وفا ہے، ہجومِ بلا ہے ۔ سلامت ملامت، ملامت سلامت!
نہ فکرِ سلامت، نہ بیمِ ملامت ۔ زِ خود رفتگی ہائے حیرت سلامت!

رہے غالبؔ خستہ، مغلوبِ گردوں
یہ کیا بے نیازی ہے، حضرت سلامت؟

کب فقیروں کو رسائی بُتِ مے خوار کے پاس ۔ تونبے بو دیجیے میخانے کی دیوار کے پاس
مژدہ، اے ذوقِ اسیری! کہ نظر آتا ہے ! ۔ م ۔ دامِ خالی، قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
جگرِ تشنۂ آزار، تسلّی نہ ہوا ! ۔ م ۔ جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس
مُند گئیں، کھولتے ہی کھولتے، آنکھیں ہے ہے ۔ م ۔ خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
میں بھی رک رک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے ۔ م ۔ دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غم خوار کے پاس
دہنِ شیر میں جا بیٹھیے، لیکن اے دل ۔ م ۔ نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس
دیکھ کر تجھ کو، چمن بس کہ نمو کرتا ہے ۔ م ۔ خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس
مر گیا، پھوڑ کے سر، غالبِؔ وحشی ہے ہے ۔ م ۔ بیٹھنا اُس کا وہ، آکر، تری دیوار کے پاس

○ ... بعد از ۱۸۲۱ء (حاشیہ ق)

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل ! م بلبل کے کاروبار پہ ہیں، خندہ ہائے گل
آزادیِ نسیم مبارک ! کہ ہر طرف م ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل
جو تھا، سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا م اے وائے ! نالۂ لبِ خونیں نوائے گل
دیوانگاں کا چارہ فروغِ بہار ہے ہے شاخِ گل میں پنجۂ خوباں بجائے گل
خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا کہ جو م رکھتا ہو، مثلِ سایۂ گل، سر بہ پائے گل
ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے، بہار م میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل
مژگاں تلک رسائیِ لختِ جگر کہاں ؟ اے وائے ! گر نگاہ نہ ہو آشنائے گل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے م مینائے بے شراب، و دلِ بے ہوائے گل
سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی م خوں ہے مری نگاہ میں، رنگِ ادائے گل
تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک م بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل
غالبؔ، مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو م جس کا خیال، ہے گلِ جیبِ قبائے گل

اپنے[1] احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں؟ ہے حیا مانعِ اظہار، کہوں یا نہ کہوں؟
نہیں کرنے کا میں، تقریر ادب سے باہر میں بھی ہوں محرمِ اسرار، کہوں یا نہ کہوں؟
شکر سمجھو اسے، یا کوئی شکایت سمجھو اپنی ہستی سے ہوں بیزار، کہوں یا نہ کہوں؟

[1] یہ غزل دیوانِ نوابِ الٰہی بخش خاں معروف دہلوی متوفی ۱۸۲۶ء کے ایک مخمس میں ملتی ہے۔ قیاس ہے کہ یہ ۱۸۲۱ء کے بعد ہی کہی گئی ہوگی کیوں کہ یہ نخ (۱۸۱۶ء) اور ق (۱۸۲۱ء) دونوں میں شامل نہیں۔

○ ... بعد از ۱۸۲۱ء (حاشیہ ق)

اپنے دل ہی سے، میں احوالِ گرفتاریِ دل جب نہ پاؤں کوئی غم خوار، کہوں یا نہ کہوں؟
دل کے ہاتھوں سے، کہ ہے دشمنِ جانی میرا ہوں اک آفت میں گرفتار، کہوں یا نہ کہوں؟
میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غمّاز گوش ہیں درپسِ دیوار، کہوں یا نہ کہوں؟
آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے، تو اسدؔ
حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں؟

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں م ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں م جادہ، غیر از نگہِ دیدۂ تصویر، نہیں
حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے م جادۂ راہِ وفا، جُز دمِ شمشیر، نہیں
رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو ! م خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر، نہیں
سر کھجاتا ہے، جہاں زخم سر اچھا ہو جائے م لذّتِ سنگ، بہ اندازۂ تقریر، نہیں
آئنہ دام کو سبزے میں چھپاتا ہے عبث کہ پری زادِ نظر، قابلِ تسخیر، نہیں
مثلِ گل، زخم ہے میرا بھی سناں سے توام تیرا ترکش ہی کچھ آبستنیِ تیر، نہیں
جب کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی دے م کوئی تقصیر، بجز خجلتِ تقصیر، نہیں
میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا، غالبؔ؟ جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں
غالبؔ[1]، اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ م "آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ، نہیں"

[1] ق : ے ریختے کا وہ ظہوری ہے، بقولِ ناسخ

○ ... بعد از ۱۸۲۱ء (آخر ق)

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے م
میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے، یہی گرمی گر اندیشے میں ہے م
آبگینہ، تُندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو، یارب، وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے؟ م
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے، تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لَت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے م
دل کی وہ حالت، کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دورِ چشمِ بدتری بزمِ طرب سے! واہ، واہ! م
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق م
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اُس کی بزم آرائیاں سُن کر، دلِ رنجوریاں م
مثلِ نقشِ مدّعائے غیر، بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق، وہ پری رُخ اور نازک بن گیا م
رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

○ ... بعد از ۱۸۲۱ء (آخر ق)

نقش کو اُس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں! م
کھینچتا ہے جس قدر، اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا، مجھ سے، مثلِ دود، بھاگے ہے، اسدؔ! م
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے؟

مسجد کے زیرِ سایہ، خرابات چاہیے م بھوں پاس آنکھ، قبلۂ حاجات چاہیے
وہ بات چاہتے ہو کہ جو بات چاہیے صاحب کے ہم لبوں کو کرامات چاہیے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر م آخر، ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
دے داد، اے فلک دلِ حسرت پرست کی م ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے
سیکھے ہیں، مہ رُخوں کے لیے ہم مصوّری م تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے، کس روسیاہ کو؟ م اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

قطعہ

نشو و نما ہے اصل سے، غالبؔ فروع کو م خاموشی ہی سے نکلے ہے، جو بات چاہیے
ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا م ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سر، پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی م رُو، سُوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات م عارف، ہمیشہ مستِ مے ذات چاہیے

○ ...بعد از ۱۸۲۱ء (آخرِ ق)

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے م تب اماں ہجر میں دی بَردِ لَیالی نے مجھے
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم م لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم م کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے
زندگی میں بھی، رہا ذوقِ فنا کا مارا نشّہ بخشا غضب اس ساغرِ خالی نے مجھے
ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا م عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے
بس کہ تھی فصلِ خزانِ چمنستانِ سخن رنگِ شہرت نہ دیا تازہ خیالی نے مجھے
جلوۂ خور سے، فنا ہوتی ہے شبنم غالبؔ
کھو دیا سطوتِ اسمائے جلالی نے مجھے

کبھی نیکی بھی، اُس کے جی میں، گر آ جائے ہے مجھ سے م
جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے
خدایا، جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے ؟ م
کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے
وہ بدخو، اور میری داستانِ عشق طولانی م
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے م
نہ پوچھا جائے ہے اس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے

○ ...بعد از ۱۸۲۱ء (آخرِ ق)

سنبھلنے دے مجھے، اے نااُمیدی، کیا قیامت ہے م
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
تکلّف برطرف، نظّارگی میں بھی سہی، لیکن ہ م
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
ہوئے ہیں پانو ہی پہلے، نبردِ عشق میں، زخمی م
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مدّعی کا ہم سفر، غالبؔ م
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

وہ، آ کے خواب میں، تسکینِ اضطراب تو دے م ولے مجھے تپشِ دل، مجالِ خواب تو دے
کرے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا م تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
دکھا کے جنبشِ لب ہی، تمام کر ہم کو م نہ دے جو بوسہ، تو منہ سے کہیں جواب تو دے
پلا دے اوک سے، ساقی، جو ہم سے نفرت ہے م پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے
یہ کون کہوے ہے آباد کر ہمیں ؟ لیکن کبھی زمانہ مرادِ دلِ خراب تو دے
اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے م کہا جو اس نے "ذرا میرے پانو داب تو دے"

ہ یہ شعر پہلے پہل متن قا میں درج ہوا

○ ... ۱۸۲۶ء

عشق، تاثیر سے نومید نہیں م جانسپاری، شجرِ بید نہیں
سلطنت دستِ بدست آئی ہے م جامِ مے، خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلّی تری، سامانِ وجود م ذرّہ، بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے م ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے م غمِ محرومیِ جاوید نہیں
کہتے ہیں "جیتے ہیں امید پہ لوگ" م ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

مئے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل
بادہ، غالبؔ! عرقِ بید نہیں

دیوانگی سے، دوش پہ زُنّار بھی نہیں م یعنی، ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں
دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے م دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے م دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں م طاقت بقدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش م صحرا میں اے خدا، کوئی دیوار بھی نہیں
گنجایشِ عداوتِ اغیار یک طرف م یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں
ڈر نالہ ہائے زار سے میرے خدا کو مان م آخر، نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں
دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی م حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

○ ... ۱۸۲۶ء

اِس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا؟ م لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا م دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں م سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے م وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں
یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟ م کہ غیرِ جلوۂ گل، رہگزر میں خاک نہیں
بھلا اُسے نہ سہی، کچھ مجھی کو رحم آتا م اثر، مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں
خیالِ جلوۂ گُل سے خراب ہیں میکش م شرابخانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ م سوائے حسرتِ تعمیر، گھر میں خاک نہیں
ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے، اسدؔ م کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

عجب نشاط سے جلّاد کے، چلے ہیں ہم آگے م
کہ اپنے سائے سے، سر، پانو سے ہے دو قدم آگے
قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت م
فقط "خراب" لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی م
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے

○ ... ۱۸۲۶ء

خدا کے واسطے! داد اس جنونِ شوق کی دینا م
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے، ہم، آگے

یہ، عمر بھر، جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے م
تمھارے آئیو، اے طرّہ ہائے خم بہ خم، آگے

دل و جگر میں پَر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے م
ہم، اپنے زعم میں، سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں، غالبؔ م
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے م نالہ، پابندِ نَے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے؟ م گر باغ گدائے مَے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے م پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے
ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی! م ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
شادی سے گزر، کہ غم نہ ہووے م اُردی جو نہ ہو، تو دَے نہیں ہے
انجامِ شمارِ غم نہ پوچھو یہ مصرفِ تا بکے نہیں ہے
کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد؟ م مَے ہے، یہ مگس کی قے نہیں ہے
جس دل میں کہ "تا بکے" سما جائے واں عزّتِ تختِ کَے نہیں ہے

○ ... ۱۸۲۶ء

ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے، غالبؔ م آخر تو کیا ہے، اَے نہیں ہے

[1] دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے م کر گئی وابستۂ تن، میری عُریانی، مجھے
بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں م مرحبا! مَیں، کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے
کیوں نہ ہو بے التفاتی؟ اُس کی خاطر جمع ہے م جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی م لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے
بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا کاشکے! م اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بُستانی مجھے
وائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا م لے گیا تھا گور میں، ذوقِ تن آسانی مجھے
وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے؟ م تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
ہاں، نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ، واہ! م پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے
دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی م میرزا یوسف ہے، غالبؔ، یوسفِ ثانی مجھے

---

[1] اس غزل کے دو شعر، تیسرا (کیوں نہ ہو...) اور چوتھا (میرے غم خانے...) نسخۂ شیروانی (۱۸۲۶ء) میں موجود ہیں۔ اور جس غزل میں یہ دو شعر اضافہ کیے گئے ہیں۔ وہ اصلاً نخ میں ہے اور اُس کی جداگانہ حیثیت ہے۔ اس لیے اصول کے مطابق اِس غزل کو قاہی میں رکھا جائے گا۔ تاہم مکمّل غزل گلِ رعنا (تکمیل ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء) میں شامل ہے۔ آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے متداول غزل کے باقی شعر اپنے بیمار بھائی یوسفؔ کی صحت یابی کی خبر (اپریل ۱۸۲۸ء) سن کر کلکتے کے قیام کے دوران میں فکر کیے ہونگے۔ چونکہ گلِ رعنا کلام کا انتخاب ہے اس لیے تین شعر (مطلع مقطع اور پانچواں شعر) انتخاب نہیں کیے گئے

۱۸۲۷ء
تا
۱۸۲۸ء

نسخۂ شیرانی

(کلام مندرجۂ حواشی)
بعد از ۱۸۲۶ء

گلِ رعنا

(تکمیلِ تدوین ۱۱ر ستمبر)
۱۸۲۸ء

○ ... بعد از ۱۸۲۶ء (حاشیہ قا)

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا م وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا
بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوِشہائے مژگاں کا؟ م کہ ہر یک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو م لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے م مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے م کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی م ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا
اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر م مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں م چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا
ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے م دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ م سبب کیا، خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا؟
نہیں معلوم، کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا! م قیامت ہے، سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا
نظر میں ہے ہماری، جادۂ راہِ فنا، غالبؔ م کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا؟ م نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا؟
تجاہل پیشگی سے مدّعا کیا؟ م کہاں تک اے سراپا ناز "کیا، کیا"؟
نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں م شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا؟
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں م تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؟

○ ...بعد از ۱۸۲۶ء (حاشیہ قا)

فروغِ شعلۂ خس، یک نفس ہے م ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا ؟
نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے م تغافل ہائے ساقی کا گِلا کیا ؟
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے م غمِ آوارگی ہائے صبا کیا ؟
دلِ ہر قطرہ، ہے سازِ "اَنا البحر" م ہم اُس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا ؟
مُحابا کیا ہے ؟ میں ضامن، اِدھر دیکھ م شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا ؟
سُن، اے غارت گرِ جنسِ وفا، سُن م شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا ؟
کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ ؟ م شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا ؟
یہ، قاتل، وعدۂ صبر آزما کیوں ؟ م یہ، کافر، فتنۂ طاقت رُبا کیا ؟
بلائے جاں ہے غالبؔ اُس کی ہر بات م عبارت کیا، اِشارت کیا، ادا کیا ؟

آبرو کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں ! م ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں
ضعف سے، اے گریہ، کچھ باقی مرے تن میں نہیں م رنگ ہو کر اُڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع، اجزائے نگاہِ آفتاب م ذرّے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم، اندھیر ہے م پنبۂ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں
رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے م انجمن بے شمع ہے گر برقِ خرمن میں نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن م غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں
بس کہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے م جلوۂ گل کے سوا، گرد اپنے مدفن میں نہیں

○ ...بعد از ۱۸۲۶ء (حاشیہ قا)

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا م خوں بھی، ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
لے گئی ساقی کی نخوت، قُلزُم آشامی مری م موجِ مے کی آج، رگ مینا کی گردن میں نہیں
ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود م قد کے جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن میں نہیں
تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر م بے تکلّف ہوں وہ مُشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

ذکر میرا، بہ بدی بھی، اُسے منظور نہیں م غیر کی بات بگڑ جائے، تو کچھ دور نہیں
وعدۂ سیر گلستاں ہے خوشا ! طالعِ شوق م مژدۂ قتل مُقدّر ہے، جو مذکور نہیں
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے، عالم م لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن م ہم کو تقلیدِ تُنُک ظرفیِ منصور نہیں
حسرت، اے ذوقِ خرابی، کہ وہ طاقت نہ رہی م عشقِ پُر عربدۂ کی گوں، تنِ رنجور نہیں
میں جو کہتا ہوں کہ "ہم لیں گے قیامت میں تمھیں" م کس عزت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"
ظلم کر ظلم، اگر لطف دریغ آتا ہو م تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
بیٹھ محراب کی قبلے کی طرف رہتی ہے م محوِ نسبت ہیں، تکلّف ہمیں منظور نہیں
صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ م ولے ! وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں
ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی، غالبؔ م میرے دعوے پہ یہ حجّت ہے کہ مشہور نہیں

نالہ، جُز حسنِ طلب، اے ستم ایجاد نہیں م ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

○ ... بعد از ۱۸۲۶ء (حاشیہ قا)

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب! م ہم کو تسلیم، نکو نامیِ فرہاد، نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم م دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے، طوفانِ حوادث، مکتب م لطمۂ موج، کم از سیلیِ استاد نہیں
وائے، محرومیِ تسلیم، و بدا! حالِ وفا م جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے؟ م گر چراغانِ سرِ رہگزرِ باد نہیں
سَبَدِ گُل کے تلے بند کرے ہے گلچیں م مژدہ، اے مرغ، کہ گلزار میں صیّاد نہیں
نفی سے کرتی ہے، اثبات، تراوش، گویا م دی ہے جائے دہن، اس کو دمِ ایجاد، نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے، بہشت م یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں
کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت، غالبؔ م تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

واں پہنچ کر، جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو م صدرہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو
دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے م کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو
ضعف سے، نقشِ پئے مور، ہے طوقِ گردن م ترے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو
جان کر کیجے تغافل، کہ کچھ امّید بھی ہو م یہ نگاہِ غلط انداز تو سَم ہے ہم کو
رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں م نالۂ مرغِ سحر، تیغِ دو دم ہے ہم کو
سر اڑانے کے، جو، وعدے کو مکرّر چاہا م ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ؟ ولیکن ناچار م پاسِ بے رونقیِ دیدہ، اہم ہے ہم کو

○ ... بعد از ۱۸۲۶ء (حاشیہ قا)

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو م ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی م ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے، یہ شہر م عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع، غالبؔ م جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو
ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو
طاقتِ رنجِ سفر بھی نہیں پاتے اتنی ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید
جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

ظلمت کدے میں میرے، شبِ غم کا جوش ہے م اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال، نہ نظّارۂ جمال م مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
ہو کر شہیدِ عشق میں، پائے ہزار جسم ہر موجِ گردِ راہ، مرے سر کو دوش ہے
مے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب م اے شوق، ہاں، اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا م کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

ے مقطعِ سلسلۂ شوق...... یہ شعر، اور ے لیے جاتی ہے کہیں ....
دبجائے ے لائی ہے معتمد الدّولہ.....) یہ ترمیم، پہلے پہل گلُ میں درج ہوئے

○ ...بعد از ۱۸۲۶ء (حاشیہ قا)

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست م بزمِ خیال، میکدۂ بے خروش ہے

ق

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل! م زنہار، اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو م میری سنو! جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی م مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط م دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر، تو بزم میں م نے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی م اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے
لطفِ خرامِ ساقی، و ذوقِ صدائے چنگ م یہ جنّتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
آتے ہیں غیب سے، یہ مضامیں خیال میں م غالبؔ، صریرِ خامۂ نوائے سروش ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری م اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ م دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مراؤں گے یار؟ م مگر آشفتہ بیانی میری
ہوں ز خود رفتۂ بیدائے خیال م بھول جانا ہے نشانی میری

▭ یہ شعر قا میں نہیں گل میں موجود ہے۔

○ ...بعد از ۱۸۲۶ء (حاشیہ قا)

متقابل ہے، مقابل میرا م رُک گیا، دیکھ روانی میری
قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں م سخت ارزاں ہے گرانی میری
گردِ بادِ رہِ بیتابی ہوں م صرصرِ شوق، ہے بانی میری
دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا م کھل گئی ہیچمدانی میری
کر دیا ضعف نے عاجز، غالبؔ م ننگِ پیری ہے، جوانی میری

سادگی پر اس کی، مر جانے کی حسرت دل میں ہے م بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
▭ دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا م میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے، ولے باایں ہمہ م ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
▭ بس ہجومِ نا امیدی، خاک میں مل جائے گی م یہ جو اک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
رنجِ رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی کو عشق ہے! م اٹھ نہیں سکتا، ہمارا جو قدم منزل میں ہے
جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل سہی م فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے؟
ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب م رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کس مشکل میں ہے

▭ یہ اشعار قا میں نہیں گل میں موجود ہیں

بعد از ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۳ء

مُتفرّق

نُسخۂ رام پور

(اوّل / قدیم)

۱۸۳۳ء

○ ... ۱۸۲۸/۲۹ء

قطعہ

دیکھنے میں ہیں اگرچہ دو پر ہیں یہ دونوں یار ایک
وضع میں گو ہوئی دوسر تیغ ہے ذوالفقار ایک

ہم سخن و ہم زباں، حضرتِ قاسمؔ و طپاںؔ
ایک طپش کا جانشیں، دَرد کا یادگار ایک

نقدِ سخن کے واسطے، ایک عیارِ آگہی
شعر کے فن کے واسطے، مایۂ اعتبار ایک

ایک وفا و مہر ہیں، تازگیِ بساطِ دہر
لطف و کرم کے باب میں زینتِ روزگار ایک

گل کدۂ تلاش کو، ایک ہے رنگ ایک بُو
ریختے کے قماش کو، پود ہے ایک تار ایک

مملکتِ کمال میں، ایک امیرِ نامور
عرصۂ قیل و قال میں، خسروِ نامدار ایک

گلشنِ اتّفاق میں، ایک بہارِ بے خزاں
میکدۂ وفاق میں، بادۂ بے خمار ایک

زندۂ شوقِ شعر کو، ایک چراغِ انجمن
کشتۂ ذوقِ شعر کو، شمعِ سرِ مزار ایک

دونوں کے دل حق آشنا، دونوں رسولؐ پر فدا
ایک محبِّ چار یار، عاشقِ ہشت و چار ایک

جانِ وفا پرست کو، ایک شمیمِ نوبہار
فرقِ ستیزہ مست کو، ابرِ تگرگ بار ایک

لایا ہے، کہہ کے یہ غزل، شائبۂ ریا سے دُور
کر کے دل و زبان کو، غالبِ خاکسار، ایک

۱؎ یہ غزل قیامِ کلکتہ کے زمانے (تکمیلِ گلِ رعنا ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء تا ستمبر ۱۸۲۹ء) میں کسی وقت کہی گئی ہوگی

۲؎ قاسم کا پورا نام مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خاں (وقائع نگارِ سلطانی) تھا۔ ۱۲ دسمبر ۱۸۴۵ء کو مرضِ وبا (ہیضہ) انتقال کیا۔
(بحوالہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی۔ اشاعت دوم۔ ص ۴۰۷)

۳؎ طپاںؔ ۔ مرزا احمد بیگ ۔ وفات ۵ مارچ ۱۸۳۳ء سے چند روز قبل۔
(بحوالہ غالب درونِ خانہ ص ۲۲۶)

○ ... ۱۸۲۸/۲۹ء

قطعہ

م

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی ۔۔۔ زیب دیتا ہے، اُسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے ۔۔۔ ناطقہ، سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے
مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے ۔۔۔ حِرزِ بازوے شگرفانِ خود آرا کہیے
مِسّی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے ۔۔۔ داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے ۔۔۔ سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے ۔۔۔ خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلا کہیے
حجرُ الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض ۔۔۔ نافہ، آہوے بیابانِ خُتن کا کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق ۔۔۔ رنگ میں، سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
صَومعے میں، اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز ۔۔۔ میکدے میں، اُسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟ ۔۔۔ کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے؟

لہ یہ قطعہ کلکتہ کے قیام کے دوران میں کہا گیا تھا۔ غالبؔ اواخرِ نومبر ۱۸۵۸ء میں مرزا حاتم علی مہرؔ کو اس قطعے کے بارے میں لکھتے ہیں:
"۔۔۔۔۔ میں نے کلکتے میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین صاحب ایک میرے دوست تھے، انھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ، اپنے کفِ دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی تشبیہات نظم کیجیے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی ان سے لی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

○ ... ۱۸۲۸/۲۹ء

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجے؟ ۔۔۔ کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے؟
کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ لکھیے؟ ۔۔۔ کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلمیٰ کہیے؟

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے!

قطعہ

... ۱۸۳۳ء (قب)

م

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں ۔۔۔ اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے! ہائے!
وہ سبزہ زار ہاے مُطرا کہ ہے غضب! ۔۔۔ وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے! ہائے!
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر! ۔۔۔ طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے! ہائے!
وہ میوہ ہاے تازۂ شیریں کہ واہ! واہ! ۔۔۔ وہ بادہ ہاے نابِ گوارا کہ ہائے! ہائے!

غزلیات

مُند گئیں، کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
یار لائے مری بالیں پہ اسے، پر کس وقت! م

لے یہ قطعہ کلکتہ سے واپسی کے بعد کہا گیا۔ اسی لیے پہلی بار قب (بحوالہ نسخۂ عرشی) میں شامل ہوا
لہ یہ شعر پہلی بار قب (بحوالہ نسخۂ عرشی) میں درج ہوا مگر اسی مفہوم کا ایک شعر حاشیہ ق میں پہلے موجود ہے ؎
مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں، ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
اور لطف یہ ہے کہ یہ دونوں شعر دیوانِ غالبؔ متداول کے لیے منتخب ہوئے ہیں

○ ... ۱۸۳۳ء (قب[1])

لو، ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں م اچھا اگر نہ ہو، تو مسیحا کا کیا علاج

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر؟ م جلتا ہوں، اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے م سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر
کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا؟ م رُکتا ہوں، تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
آتا ہے میرے قتل کو پُرجوشِ رشک سے م مرتا ہوں، اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق م لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
واحسرتا! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ م ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ م لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
زُنّار باندھ، سُبحۂ صد دانہ توڑ ڈال م رہرو چلے ہے، راہ کو ہموار دیکھ کر
اُن آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں م جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر
کیا بدگماں ہے مجھ سے، کہ آئینے میں مرے م طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طور پر م دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
سر پھوڑنا وہ، غالبِ شوریدہ حال کا م یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر

---

[1] بحوالہ نسخۂ عرشی

○ ... ۱۸۳۳ء (قب[1])

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دُور م رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زلف کہیں میں ہیں اے خدا م رکھ لیجو، میرے دعویِ وارستگی کی شرم

مہرباں ہو کے بُلا لو مجھے، چاہو جس وقت م میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے؟ م بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ م کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں م کبھی صبا کو، کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے م کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو م یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہرِ طرفِ کُلہ کو کیا دیکھیں؟ م ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

واں اُس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار م یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں، ذوقِ ستم تو دیکھ م آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو م ہم سخن کوئی نہ ہو، اور ہم زباں کوئی نہ ہو

---

[1] بحوالہ نسخۂ عرشی

○ ...۱۸۳۳ء (قب[1])

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے م کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار، تو کوئی نہ ہو تیماردار م اور اگر مر جائیے، تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے م

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے م

دل سے، تری نگاہ، جگر تک اُتر گئی م دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا! لذتِ فراغ م تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؟ م اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
اُڑتی پھرے ہے خاکِ مری کوے یار میں م بارے اب اے ہوا، ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو، دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا م موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بُوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی م اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا م مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا م کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

[1] بحوالہ نسخۂ عرشی

○ ...۱۸۳۳ء (قب[1])

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں، تمھیں م وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے م جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سایے کی طرح ساتھ پھریں، سرو و صنوبر م تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب نازِ گراں مایگیِ اشک بجا ہے م جب لختِ جگر، دیدۂ خونبار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر! م کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے
اُس چشمِ فسوں گر کا، اگر پائے اشارہ م طوطی کی طرح آئنہ گفتار میں آوے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب م اک آبلہ پا وادیِ پُرخار میں آوے
مرجاؤں نہ کیوں رشک سے؟ جب وہ تنِ نازک م آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے
غارت گرِ ناموس نہ ہوگر ہوسِ زر م کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے
تب چاکِ گریباں کا مزا ہے دلِ نالاں! م جب اک نفَسِ اُلجھا ہوا خار میں آوے
آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے م اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے
گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے م جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

رُباعیات

۱

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی م لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

[1] بحوالہ نسخۂ عرشی

○ ...۱۸۳۳ء (قبل)[1]

۲

دل، سخت نژند ہوگیا ہے، گویا — اُس سے گلہ مند ہوگیا ہے، گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں — غالبؔ، منہ بند ہوگیا ہے، گویا

۳

دُکھ، جی کے پسند ہوگیا ہے، غالبؔ — دل، رُک رُک کر، بند ہوگیا ہے، غالبؔ
واللہ، کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں — سونا، سوگند ہوگیا ہے، غالبؔ

---

[1] بحوالہ نسخۂ عرشی

۱۸۳۴ء تا ۱۸۴۷ء

مُتفرّق

اِنتخابِ غالبؔ ۱۸۳۶ء

نسخۂ بدایوں ۱۸۳۸ء

پہلا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۴۱ء

نسخۂ ویلسنہ ۱۸۴۵ء

نسخۂ کریم الدّین (کراچی) ۱۸۴۵ء

دوسرا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۴۷ء

○ ۱۸۳۵ء...

غزلیات

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے — فقط اک شعر میں اندازِ رسا رکھتے تھے
اس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا — آپ کہتے تھے ہم اور آپ اٹھا رکھتے تھے
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ م — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے[1]

○ ۱۸۳۸ء... (قبا)

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو م — رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو
دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو م — ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو
بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ م — ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور م — تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو
اللہ رے! ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ م — ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو
ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف م — اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو
پیچارہ کتنی دور سے آیا ہے، شیخ جی — کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پانو

---

[1] گلشنِ بے خار مولفۂ آخر ۱۲۵۰ھ (اپریل ۱۸۳۵ء) میں صرف یہی شعر (مقطع) پایا جاتا ہے مگر قبا میں یہ تینوں شعر ایک ساتھ درج ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے اوپر کے دو شعر بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں شعر قطعہ بند ہیں

[2] یہ شعر م میں مطبوعہ موجود ہے مگر بعد میں حذف کر دیا گیا۔ تذکرہ سراپا سخن میں پانو والی ردیف میں درج ہے۔ عرشی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ قبا میں بھی موجود ہے

○ ۱۸۳۸ء... (قبا)

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں؟ م — دُکھتے ہیں آج اُس بُتِ نازک بدن کے پانو
غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو؟ م — پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

قطعہ

... بعد از ۱۸۳۸ء (حاشیہ قبا)

گئے وہ دن کہ ناداستہ غیروں کی وفاداری م — کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی، جانے دو، جانے دو م — قسم لو ہم سے اگر یہ بھی کہیں: "کیوں، ہم نہ کہتے تھے؟"

غزلیات

تاہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے، جا م — سُن لیتے ہیں، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالبؔ ترا احوال سُنا دیں گے ہم اُن کو م — وہ سُن کے بُلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے م — مرتے ہیں، ولے اُن کی تمنّا نہیں کرتے
در پردہ اُنھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی م — ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پروا نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے م — غالبؔ کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

○ ... بعد از ۱۸۳۸ء (حاشیہ قبا)

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جاوے مجھے م میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
کیا تعجب ہے، کہ اُس کو دیکھ کر آ جائے رحم؟ م واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے
منہ نہ دکھلاوے، نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب م کھول کر پردہ، ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے
یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں م زلف گر بن جاؤں، تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

رُباعیات

(۱)

بھیجی ہے جو، مجھ کو شاہِ جمجاہ نے داں م ہے لطف و عنایتِ شہنشاہ پہ داں
یہ شاہ پسند داں، بے بحث و جدال م ہے دولت و دین و دانش و داد کی داں

... (بعد از ۱۸۳۸ء۔ حاشیہ قبا) ۱۸۴۱ء (م) (۲)

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم م آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں، سائل و عالی باہم م ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم

غزل

... ۱۸۴۵ء

نویدِ امن ہے، بیدادِ دوست، جاں کے لیے م رہی نہ، طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

لے غزل میں نواب تجمل حسین خاں فرخ آبادی سے متعلق مدحیہ اشعار ہیں۔ نواب صاحب کا انتقال ۹ نومبر ۱۸۴۶ء کو ہوا تھا۔ غزل نسخۂ کراچی مکتوبہ ۳۰ اگست ۱۸۴۵ء میں نہیں ہے لہٰذا اسے ۳۰ اگست ۱۸۴۵ء تا ۹ نومبر ۱۸۴۶ء کی فکر کردہ تسلیم کرنا چاہیے ۔ دیوان ذوق مرتبہ آزاد میں درج ہے کہ یہ غزل نواب اصغر علی خاں نسیم رام پوری مقیم دہلی کے طرحی مشاعرہ منعقدہ ۱۸۴۵ء میں پڑھی گئی تھی۔ ذوق، مومن، داغ وغیرہ بھی موجود تھے۔ گویا مشاعرہ ۱۸۴۵ء میں بعد از ۳۰ اگست منعقد ہوا تھا۔ ظاہر ہے غزل بھی اسی زمانے میں کہی گئی ہوگی

○ ... ۱۸۴۵ء

بلا سے، گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے م رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لیے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق، اے خضر م نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
رہا بلا میں بھی، میں مبتلائے آفتِ رشک م بلائے جاں ہے، ادا تیری اک جہاں کے لیے
فلک نہ دور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں م دراز دستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر م کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے م اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے
یہ قدرِ شوق نہیں، ظرفِ تنگنائے غزل م کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے
دیا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے م بنا ہے عیشِ تجمل حسین خاں کے لیے
زباں پہ بارِ خدایا، یہ کس کا نام آیا؟ م کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک م بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے
زمانہ عہد میں اُس کے، ہے محوِ آرائش م بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے
ورق تمام ہوا، اور مدح باقی ہے م سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے
ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا م صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

قطعہ

... ۱۸۴۷ء (م)

پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے م مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
کھائے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر م جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

○ ۱۸۴۷ء۔۔۔

غزلیات

جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں نیچے کے ٹانکوں سے سوا ہیں[1]

۱۸۴۷ء۔۔۔ (؟)

کی وفا ہم سے، تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں م ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے م کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے، کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انھیں کچھ نہ کہو م جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
دل میں آ جائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے م اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ ادراک سے، اپنا مسجود م قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نُما کہتے ہیں
پائے افگار پہ، جب سے تجھے رحم آیا ہے م خارِ رہ کو ترے، ہم مہر گیا کہتے ہیں
اک شرر دل میں ہے، اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا؟ م آگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں
دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ م اُس کی ہر بات پہ، ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید م "مر گیا غالبِ آشفتہ نوا" کہتے ہیں

---

[1] یہ ہنگامی مطلع عہدِ اسیری کی یادگار ہے۔ دیکھیے کلامِ (گھنشیام لال) عاصی مطبوعہ ۱۹۳۹ء، آبِ حیات از آزاد میں پہلا مصرع یوں ہے ؎
ہم غمزدہ جس دن سے گرفتارِ بلا ہیں

○ ۱۸۴۷ء۔۔۔ (؟)

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں م اک چھیڑ ہے، وگرنہ مُراد امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجیے اِس لطفِ خاص کا؟ م پُرسش ہے، اور پاسِ سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز، ستم گر کو ہم عزیز م نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
بوسہ نہیں، نہ دیجیے، دُشنام ہی سہی م آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دہاں نہیں
ہر چند جاں گدازیٔ قہر و عتاب ہے م ہر چند پشت گرمیٔ تاب و تواں نہیں
جاں مطربِ ترانۂ "ھَل مِن مَزید" ہے م لب پردہ سنج زمزمۂ "الاماں" نہیں
خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دو نیم م دل میں چھری چبھو، مژہ گر خونچکاں نہیں
ہے تنگِ سینہ، دل اگر آتش کدہ نہ ہو م ہے عار دل، نفس اگر آذر فشاں نہیں
نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب م سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں
کہتے ہو "کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں؟" م گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں
پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی م روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں
جاں ہے بہائے بوسہ، و لے کیوں کہے ابھی؟ م غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

ملتی ہے خوئے یار سے، نارِ التہاب میں م کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں؟ م شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ، انتظار میں، نیند آئے عمر بھر م آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے، خط اک اور لکھ رکھوں م میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں

) ... ۱۸۴۷ء (ما)

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟ م ساقی نے کچھ مِلا نہ دیا ہو شراب میں
جو مُنکرِ وفا ہو، فریب اُس پہ کیا چلے؟ م کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں
ہیں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے؟ م ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں؟
ہیں اور حظِّ وصل، خدا ساز بات ہے م جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے م ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
لاکھوں لگاؤ، ایک چُرانا نگاہ کا م لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ، دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے! م جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر، مدّعا طلبی میں نہ کام آئے! م جس سحر سے سفینہ رواں ہو سَراب میں
غالبؔ چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی م پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں م یہ سُوءِ ظن ہے، ساقیِ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند م گستاخیِ فرشتہ، ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع؟ م گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں، دیکھیے، تھمے م نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں
اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے م جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے م حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر م یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

○ ... ۱۸۴۷ء (ما)

شرم اک ادائے ناز ہے، اپنے ہی سے سہی م ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز م پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں
ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود م ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں
غالبؔ، ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست م مشغولِ حق ہوں، بندگیِ بوتراب میں